اردو افسانے میں استحصالی رویوں کا اجمالی جائزہ
(آغاز تا ۱۹۳۶ء منتخب افسانہ نگاروں کے تناظر میں)
The Narrative of Exploitation in Urdu Short Story

صبغت اللہ* / ڈاکٹر سلمان علی**

Abstract:

Fiction in Urdu literature is one of those genres which have shed fresh blood in literature through their own means in every age and its importance cannot be denied in any way. Thus, from the very beginning, fiction has absorbed various movements and trends through itself, and fiction has not shown any shortsightedness in presenting the problems, difficulties, trends and modern situation of each era.

In the same way, fiction also portrayed the exploitation of the Indian people under the influence of Indian colonialism. In this regard, all the great fiction writers made the exploitation of the people here the subject of their fictions. In this regard, various aspects of exploitation can be seen in the above-mentioned fiction writers. These exploitative attitudes in the article under review have been discussed in a research and critical manner.

ملخص

اردو ادب میں افسانہ کا شمار ان اصناف میں ہوتا ہے کہ جن اصناف نے ہر عہد میں اپنے ذریعہ سے ادب میں تازہ خون دوڑایا اور اس کی اہمیت سے کسی طور بھی انکار ممکن نہیں۔ یوں تو آغاز سے ہی افسانے نے اپنے ذریعے

---

*پی ایچ ڈی اسکالر شعبہ اردو جامعہ پشاور

**پروفیسر، شعبہ اردو جامعہ پشاور

سے مختلف تحاریک اور رجحانات کو اپنے اندر سمویا، اور ہر عہد کے مسائل، مشکلات، رجحانات اور عصری صورت حال کی پیش کش میں افسانے نے کسی قسم کی کوتاہ بینی کا ثبوت نہیں دیا۔ بالکل اسی طرح ہندوستانی استعمار کے زیر اثر ہندوستانی عوام کے استحصال کو بھی افسانے نے پیش کیا اس ضمن میں تمام بڑے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں یہاں کے عوام کے استحصال کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ اس ضمن میں استحصال کی مختلف جہتوں کو مذکورہ افسانہ نگاروں کے ہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ زیر نظر آرٹیکل افسانہ میں موجود انہی استحصالی رویوں سے تحقیقی و تنقیدی انداز میں بحث کی گئی ہے۔

کلیدی الفاظ: افسانہ، استعمار، جنگ عظیم، استحصال، استحصالی رویے

اردو افسانہ فن، فکر اسلوب، تکنیک، ہیت غرض ہر حوالے سے اس قدر توانا اور جان دار صنف ہے کہ اسے عالمی ادب میں بڑے فخر کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ابتدا ہی سے اسے ایسے قد آور تخلیق کار ملے جنہوں نے بہت کم عرصے میں اس قدر متنوع فنی و فکری کمالات سے اس کا دامن بھر دیا کہ آج یہ سے لے کر مابعد الطبیعات سماج و معاشرت سے لے کر ثقافت و تمدن اور علوم و فنون سے لے کر کلچر و تہذیب تک بے شمار شوخ رنگوں کا نگار خانہ معلوم ہوتا ہے۔

جہاں تک اردو افسانے میں استحصالی رویوں کی روایت کا تعلق ہے تو یہ اصطلاح نہ صرف اردو افسانے بلکہ مجموعی طور پر اردو ادب کو ترقی پسند تحریک نے ودیعت کی ہے۔ البتہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ترقی پسند تحریک سے قبل بھی اردو افسانے میں استحصالی رویوں کی عکاسی کی ایک جان دار روایت پائی جاتی ہے۔ جس میں بیشتر وہی افسانہ نگار ہیں جو بعد میں باقاعدہ ترقی پسند تحریک کی منشور کے تحت لکھنے لگے اور اس ضمن میں یہ سوال بھی ذہن میں ابھرتا ہے کہ مذکورہ روایت وہاں بھی ایک خاص چمک کے ساتھ موجود ہے، تو پھر ترقی پسند تحریک کے وجود کا کیا تک بنتا ہے؟ اور پھر ترقی پسند تحریک سے قبل استحصالی رویوں کی عکاسی کی نوعیت کیا تھی اور ترقی پسند افسانے میں استحصالی رویوں کی عکاسی کس نوعیت کی ہے یا بہ الفاظ دیگر مذکورہ دونوں روایات میں فرق کس نوعیت کا ہے؟

ذیل میں جو بحث کی جائے گی اس میں نہ صرف دونوں سوالات کے جوابات موجود ہوں گے بلکہ اس کے مختلف پس منظری حوالے بھی سامنے آجائیں گے۔

مذکورہ منظری دو بڑی جہتوں پر مشتمل ہے:

۱۔ قومی یا مقامی سطح پر بدلتے ہوئے سیاسی سماجی معاشرتی اور تہذیب حالات

۲۔ بین الاقوامی سطح پر بدلتے ہوئے سیاسی سماجی معاشرتی اور تہذیب حالات

جہاں تک قومی اور مقامی یا ہندوستانی سطح پر تبدیل ہونے والے حالات کا تعلق ہے تو بیسویں صدی کے اوائل میں اصلاح و احیا کا دوسرا دور شروع ہوا اور بدلتے وقت کے پہلو بہ پہلو حالات بھی بدلنے لگے ،نئے نئے مسائل نے جنم لیا، اب مفاہمت کی جگہ تصادم اور استدلال کی بجائے شدت کے عناصر کو فروغ، آزادی کی تحریکیں اور مذہبی و تہذیبی انتہا پسندی مقبول ہونے لگی اور مختلف اقوام میں کشمکش کے عمل میں تیزی آگئی ۱۹۱۹ء میں جلیاں والا باغ کا قتل عام، سائمن کمیشن، تحریک خلافت، تحریک ہجرت، سول نافرمانی کی تحریک، عدم تعاون، روزانہ جنگ آزادی کی آگ کے بلند ہوتے شعلے اور بالخصوص سیاسی حوالے سے حالات کی ہنگامی خیزی ایسے واقعات تھے، جنہوں نے ہندوستانی عوام کو سوچنے پر مجبور کیا اور نتیجتاً عوام میں سیاسی شعور بیدار ہوا، متحد ہو کر احتجاج کرنے اور اپنے مطالبات پیش کرنے کے عمل کو تقویت ملی سیاسی جماعتوں اور انجمنوں کی تشکیل ہوئی اور حکومت کو اس بات پر مجبور کیا جانے لگا کہ وہ عوامی مسائل کی جانب توجہ دینے لگی۔

اس کے علاوہ ہندوستان کے معاشی حالات نہایت خستہ ہوگئے ۔حکومت نے مختلف جاگیر داروں، نوابین، امرا اور مدرسوں کی تحویل میں دی گئی زرعی زمینوں کو اپنے منظور نظر افراد میں بھاری ٹیکسوں کے ساتھ تقسیم کیا۔ فنون کی ناقدری، پیشہ مصاحبت کے اختتام اور نوابی نظام کے خاتمے سے لاکھوں افراد بے روزگار ہوگئے۔ مزید برآں زمین داروں جاگیر داروں، نام نہاد، مذہبی ٹھیکے داروں اور ہر خود غلط ملاؤں نے مختلف طریقوں سے لوگوں کا استحصال کرنا شروع کیا۔

جہاں تک بین الاقوامی سطح پر بدلتے ہوئے تہذیبی، سماجی، سیاسی اور معاشی حالت کا تعلق ہے، تو بین الا براعظمی مخاصمت نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ پہلی جنگ عظیم میں کروڑوں انسان تہہ تیغ ہوئے، کاروبار تباہ ہوئے ،کارخانے بند، فصلیں برباد اور بازار اجڑ گئے، کساد بازاری نے ہر جگہ لوگوں کو اقتصادی بحران کا شکار کیا، سرمایہ داروں نے جنگ کے اخراجات مزدوروں کی اجرتوں میں کمی کر دی، نیز ہر جگہ استحصالی رویے سر اٹھانے لگے۔

۱۹۱۷ء میں انقلاب روس نے محکوم اور استحصال کے شکار قوموں میں نیا ولولہ بھر دیا کٹھ پتلی بنے مظلوم، طبقوں، مزدوروں کسانوں اور محنت کشوں کے اندر اپنے حق کے لیے نعرہ احتجاج بلند کرنے کا احساس پیدا کیا، یہ احساس اس قدر تند و تیز انداز میں پیدا ہوا کہ اس کے حامیوں نے دنیا بھر میں استحصالی قوتوں کے خلاف مسلح جدو جہد شروع کی، وسطی ایشیا کی دیکھا دیکھی چین، ایران، اور ترکی سے انقلابی جماعتیں اور اشتراکی شعلے اٹھتے ہوئے

لاطینی امریکہ تک پہنچے۔ اس تمام منظر نامے کو ترقی پسند تحریک سے قبل حقیقت نگاری اور اصلاح پسندی کی تحریک سے وابستہ افسانہ نگار بھی جانچ پر کھ اور لکھ رہا تھا، اور ترقی پسند مینی فیسٹو کے تحت لکھنے والا افسانہ نگار بھی قلم بند کر رہا تھا، لیکن دونوں میں فرق یہ تھا کہ اول الذکر اسے شعوری اور لاشعوری دونوں طرح سے قلم بند کر رہا تھا اور ترقی پسند افسانہ نگار باقاعدہ شعوری اور منصوبہ بند طریقے سے اسے افسانے کے بطن میں سمو رہا تھا دونوں کے نتائج مماثل ہونے کے باوجود کسی حد تک دونوں میں تھوڑا بہت فرق بھی تھا اور اس فرق کو شہزاد منظر نے یوں بیان کیا ہے۔

> "سماجی حقیقت نگاری اور ترقی پسند افسانے میں بنیادی فرق یہ ہے کہ سماجی حقیقت نگاری خود کو صرف معاشرے کی تنقید تک محدود رکھتی ہے جب کہ ترقی پسند افسانہ قاری کو معاشرے کو بدلنے کے لیے متحرک کرتا ہے اس طرح ترقی پسند افسانہ نگار وہ ہے جو معاشرے کی تنقید کے ساتھ ساتھ اسے بدلنے کا قائل بھی ہوا۔"(۱)

بہر حال نے ترقی پسند افسانے نے ایک مخصوص منصوبہ بند انداز سے زندگی کے کلیدی مسائل کے بیان کو اپنا مخصوص وظیفہ بنایا اور طبقاتی درجہ بندی م سرمایہ دارانہ نظام کی قباحتوں، جاگیر دارانہ نظام کی سفاکیوں، مذہب، جنس جنگ اور سماج کے بارے میں رجعت پسندی اور توہم پرستی اور اضمحلال جیسے بڑے بڑے استحصالی رویوں کی بھرپور مذمت کی بالخصوص مزدوروں کسانوں خدمت گزار تنخواہ داروں اور کم اجرت پانے والے ملازموں کے مسائل کے خلاف بھی شعلہ نوائی کی۔ اس کے ساتھ ساتھ معاشی جبر کے شکار مظلوموں کی حالت ذار نچلے طبقے کی تنگ دستی اور اس کے نتیجے میں پیدا شدہ نفسیاتی الجھنوں کی عکاسی کرنے کے علاوہ معاشرے کے بالا دست طبقوں کے حریصانہ رویوں، نام نہاد مذہبی ٹھیکے داروں کے حیلہ سازیاں، ارواح پرستی، ماضی پرستی اور توہم پرستی جیسے انسان کش موضوعات کو ان کے افسانوں کا خاص موضوع بنے، غرض ہر انسانیت کش، حقیقت کش، اور کش استحصالی رویے کے خلاف ان کے قلم شعلے اگلنے لگے۔ یوں تو اردو افسانے میں استحصالی رویوں کی عکاسی کرنے والے سیکڑوں افسانہ نگار اردو افسانے کی تاریخ کا حصہ ہیں، لیکن ان میں مزید چند نمائندہ افسانہ نگاروں کے ہاں استحصالی رویوں کی عکاسی کی روایت کا جائزہ ذیل میں لیا جائے گا۔

اردو افسانے میں استحصالی رویوں کی عکاسی کی روایت اتنی ہی پرانی ہے جتنا کہ اردو افسانہ خود، واقعہ یہ ہے کہ اردو افسانے کی روایت کی تشکیل ابتدا ہی سے دو بڑے رجحانات کے زیر اثر ہوئی۔

۱۔ رومانی رجحان ۲۔ اصلاحی رجحان

دیکھا جائے تو دونوں رجحانات کی تشکیل اس قدر دل کش موثر پختہ اور روشن ہے کہ اس کے نقوش ایک طویل عرصے تک اردو افسانے کی روایت پر چھائے دکھائی دیتے ہیں۔ اول الذکر رجحان کے علم بردار سجاد حیدر یلدرم اور آخر الذکر رجحان کی بنیاد پریم چند نے رکھی اور یہ دونوں حضرات اردو افسانے کی روایت میں الگ الگ دبستانوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دبستان یلدرم سے وابستہ افسانہ نگاروں میں نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھ پوری، حجاب امتیاز علی، مہدی افادی، وغیرہ پائے جاتے ہیں جنہوں نے افسانے کو رومانوی خطوط تک ہی محدود رکھا، لیکن دبستان پریم چند سے وابستہ افسانہ نگاروں نے اصلاح پرستی، قوم پرستی، حب الوطنی، حقیقت نگاری، اور معاشرتی مسائل کی طرف افسانے کا رخ موڑ کر اس میں لازوال وسعتیں پیدا کیں۔ مذکورہ افسانہ نگاروں میں حیات اللہ انصاری، اعظم کریوی، اختر انصاری، پریم چند کا شمار اردو افسانے کی روایت کے بنیاد گزار قلم کاروں میں ہوتا ہے انھوں نے کل ۲۹۶ افسانوں سے اردو ادب کو نوازا، جن کو چھ جلدوں میں مرتب کر کے مدن گوپال نے کلیات پریم چند کے نام سے شائع کیا۔ پریم چند کے افسانوں کا تخلیقی سفر ۳۶ سال کے طویل عرصے پر محیط ہے، لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ابتدا ہی سے افسانوں کا رخ معاشرے اور سماج کی جانب موڑا ہر چند کہ ابتدا میں وہ آریہ سماج ذہن کے ترجمان دکھائی دیتے ہیں اور گاندھی طرز فکر کے مبلغ لیکن آخر میں زندگی کے تلخ مسائل کی طرف توجہ دیتے ہوئے فرقہ پرستی، نسلی تعصب، توہم پرستی، سماج مذہب اور معاشرت کے بارے میں رجعت پسندانہ رویوں اور بالخصوص انسانی استحصال کے خلاف خوب جم کے لکھا۔

پریم چند کی افسانہ نگاری کا سفر ۱۹۰۱ء سے شروع ہو چکا تھا لیکن ان کا پہلا باقاعدہ افسانہ دنیا کا سب سے انمول رتن ہے ۱۹۰۷ء میں طبع ہوا اور بعد میں ان کے پہلے افسانوی مجموعے "سوز وطن" مطبوعہ ۱۹۰۸ء میں بھی چھپا، ہر چند کہ انگریزی سامراج نے مذکورہ مجموعے کو فکری اختلاف کی بنا پر نذر آتش کیا، لیکن پریم چند کے قلم میں مزید تیزی اور فکر میں مزید تقویت آئی اور یوں انھوں نے پریم پچیسی، خاک و پروانہ، خواب و خیال، اور آخری تحفہ جیسے اہم مجموعے تخلیق کیے۔ جس میں ان کا سماجی شعور بہت ابھر کر سامنے آیا۔ بالخصوص انھوں نے ہندوستان کے دیہی علاقوں میں بسنے والے استحصال زدہ طبقوں کو اپنے افسانوں میں خاص جگہ دی۔

پریم چند نے بڑی عرق ریزی سے مزدوروں، محنت کشوں اور کسانوں کی کس مپرسی کو اپنے افسانوں کے پیکر میں پیش کیا، کیوں کہ عام طور پر یہی گمان رہا ہے کہ دیہاتی باشندوں کی زندگی کھیتوں کھلیانوں، بارونق فضاؤں، فطری ماحول اور خالص خورد و نوش کی بنا پر کافی آسودہ اور اطمینان بخش ہوتی ہے، لیکن پریم چند نے مذکورہ طبقوں کی

زندگیوں کا گہرا اور حقیقی مشاہدہ کر کے ان کی اذیتوں اور کرب ناکیوں کی ایسی ایسی تصویریں پیش کیں ہیں کہ قاری کی روح کانپ اٹھتی ہے، کیوں کہ کسان محنت کش اور مزارع اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کے بعد بھی نہ صرف دو وقت کی روٹی کے لیے ترستا ہے، بلکہ ہمیشہ زمین داروں اور جاگیر داروں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا رہتا ہے اور ان کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر سیٹھ ساہوکار اور زمین دار طبقہ مسلسل ان کا استحصال کرتا رہتا ہے۔

پریم چند نے اپنے افسانوں میں ایسے مذموم اور استحصالی رویوں کے حامل سفید پوش طبقے کے خلاف لکھ وہ بات کہ دی جو صدیوں سے گوشہ گم نامی میں پڑی تھی اس حوالے سے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

"پریم چند نے اردو افسانے کو داستانی ماحول سے نکال کر اس کا رشتہ زندگی سے قائم کر دیا تھا چناں چہ پریم چند کے افسانوں میں ہندوستانی معاشرہ اپنے حقیقی روپ میں نظر آتا ہے۔"(۲)

استحصالی رویوں کے حوالے سے ان کے افسانے خون سفید، بانکا زمین دار، پچھتاوا، بنک کا دیوالہ، درگا مندر، دست غیب، بھاڑے کا ٹٹو، سوا سیر گیہوں، چوری، دیوی اور زیور کا ڈبہ وغیرہ ان کے اہم افسانے ہیں، لیکن اس حوالے نہ صرف ان کا بلکہ اردو ادب کا نمائندہ افسانہ کفن ہے۔ جس میں استحصالی رویوں کی مذمت غیر معمولی فن کارانہ انداز میں کی گئی ہے۔

بدری ناتھ سدا بہار پھول، چندن، قوس قزح، بہارستان، طائر خیال، آزمائش اور دیگر افسانے، چشم وچراغ، سولہ نگار، صبح وطن، انھیں بآسانی پریم چند کے مقلدین میں سب سے اوپر رکھا جا سکتا ہے۔ پریم چند نے دیہاتی معاشرے کی عکاسی، سدرشن نے افسانے کا رخ شہر کی جانب موڑا اور بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی کے اہم افسانہ نگار پریم چند کے دور کی مثالیت، روحانیت اور جذباتیت، ان کے ہاں استحصالی رویوں کی عکاس ہے، مگر وہ اصلاح میں اس قدر مگن ہوگئے کہ ماں کی ماتا جیسے افسانے میں انسان دوست حکیم اپنی بیٹی کی عصمت دری کے واقعے کو فراموش کر کے سیٹھ کشوری لال کا علاج معالجہ کرتے ہیں نظر آتے ہیں، البتہ ان کے ہاں ذات پات اور ہندو معاشرے میں طبقاتی نظام کی سخت مذمت ملتی ہے۔

متوسط ہندو گھرانوں کی زندگی کا افسانوں کا موضوع ہندو سفید پوش طبقے کی زندگی کی حقیقی ترجمانی انھوں نے اپنے افسانوں اپنی طرز زندگی دیکھ کر، صدائے جگر فروش اور خانہ داری سبق میں کی ہے۔

البتہ دیہاتی زندگی کی پیش کش کے دوران ان کے قلم میں حقیقی مرقع نگاری کا رنگ زیادہ ابھرا ہے، لیکن پریم چند کے پیش کردہ اور سدرشن کے دیہات میں فرق ہے پریم چند معاشرتی یا انسانی جبر و استحصال کے مختلف سرچشموں کو بے نقاب کرتے ہیں جب کہ سدرشن دیہاتی زندگی کی کس مپرسی و بدحال کے حائل کا تعلق براہِ

راست معاشرتی زندگی سے جوڑتے نظر آتے ہیں اور اقتصادی بد حالی کو ہی محنت کش طبقے کی تنزلی ویسی کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اس کے علاوہ شودروں کی حالتِ زار، مہاجنوں اور زمین داروں کے استحصالی رویے کے خلاف وہ خوب جم کر لکھتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ محنت کش طبقے کے اقتصادی مسائل کو اپنی توجہ کا خاص مرکز بناتے ہیں اور بسا اوقات توان پر مزدوروں، محنت کش اور مزارعین وغیرہ کی محنت اس قدر غالب آجاتی ہے۔ ان کی کہانی دکھ بھری کہانیوں کے کردار مثالیت کے شاہکار ہوجاتے ہیں۔ بہر حال محنت کش طبقے کا استحصال کرنے والے تمام منفی عناصر کو وہ اپنے مخصوص انداز میں افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔

سدابہار پھول، چندن، قوس و قزاح، بہارستان، طائرِ خیال، آزمائش اور دیگر افسانے، چشم و چراغ، سولہ سنگار، اور صبح وطن جیسے افسانوی مجموعے اردو ادب کو عطا کرنے والے اردو کے افسانے کے بنیاد گزار افسانہ نگاروں میں "بدری ناتھ سدرشن" کا نام کئی حوالوں سے اہم ہے لیکن ان کے افسانوں کا بنیادی رنگ استحصالی رویوں کی عکاسی اور اس کی بھرپور مذمت ہے۔ سدرشن خالصتاً پریم چند کے مقلد ہیں۔ یہ دعویٰ بڑے بڑے نقادوں نے کیا ہے اور اس حوالے سے ان کی رائے ٹھیک بھی ہے، لیکن دونوں میں بنیادی فرق کی طرف کم ہی نقادوں کی نظر گئی ہے اور مذکورہ فرق دو حوالوں سے ہے جو کہ ہے تو بہت معمولی سا لیکن ہے ضرور، اور اس کی نشان دہی یقیناً لازمی ہے۔

پریم اور سدرشن کے افسانوی لب و لہجے اور طرزِ فکر میں جو فرق ہے وہ دو سطحوں پر مشتمل ہے پہلا فرق یہ ہے کہ پریم چند دیہاتی زندگی کی عکاسی کی جب کہ سدرشن نے اپنے افسانوں کا رخ دیہات سے شہر کی جانب موڑا جو باریک تر سہی لیکن ہے ضرور، مذکورہ فرق کی دوسری سطح یہ ہے کہ پریم چند اپنے افسانوں میں معاشرتی یا انسانی جبر و استحصال کے مختلف سرچشموں کو بے نقاب کرتے نظر آتے ہیں جب کہ سدرشن معاشرتی دیہاتی زندگی کی بدحالی و کس مپرسی کا تعلق براہ راست معاشرتی زندگی سے جوڑتے ہوئے محنت کش طبقے کی تنزلی و پستی کی وجہ اقتصادی بدحالی ہی کو ٹھہراتے ہیں اور اس منظر نامے پر بحث کرتے ہوئے وہ محنت کشوں، مزدوروں اور شودروں کی حالتِ زار بیان کرتے ہوئے مہاجنوں، سرمایہ داروں اور زمین داروں کے استحصالی رویوں کے خلاف خوب جم کر لکھتے ہیں اس حوالے سے وہ محنت کش طبقے کے اقتصادی مسائل کو اپنی توجہ کا خاص مرکز بناتے ہیں جس میں بسا اوقات ان پر محنت کشوں مزدوروں اور مزارعین وغیرہ کی محبت اس قدر غالب آجاتی ہے کے ان کے افسانوں کی دکھ بھری کہانیوں کے کردار مثالیت کے شکار ہوجاتے ہیں۔

سدرشن کے افسانوں میں جذباتیت، روحانیت اور مثالیت کی ملی جلی کیفیات کے ساتھ ساتھ استحصالی

رویوں کی عکاسی بھی خاص انداز میں ملتی ہے لیکن اس دور وہ اصلاح میں اس قدر مگن دکھائی دیتے ہیں کہ ماں کی مامتا جیسے افسانے میں ایک انسان دوست حکیم (ان کا تخلیق کردہ کردار) اپنی بیٹی کی عصمت دری کو فراموش کر کے سیٹھ کشوری لال کا علاج کرتا نظر آتا ہے البتہ ہندو معاشرے میں ذات پات اور طبقاتی نظام کے خلاف ہمیشہ وہ طنز کے تیر برساتے نظر آتے ہیں اور اس حوالے ان کا افسانے " اپنی طرف دیکھ " صدائے جگر خراش اور خانہ دار سبق اہم افسانے ہیں۔

علی عباس حسینی نے اپنے افسانوی مجموعوں رفیق تنہائی کچھ نہیں ہے، میلہ گھومنی، باسی پھول، آئی سی ایس اور دوسری کہانیاں، کانٹوں میں پھل اور ہمارا گاؤں جیسے مجموعوں میں متعدد موضوعات کو افسانوں کے پیکر میں پیش کیا لیکن ان کے ہاں غالب رنگ ان استحصالی رویوں کی عکاسی ہے جو ان کے گرد و پیش میں نظر آتے ہیں یوں تو ڈاکٹر انوار احمد نے انہیں ایک صالح ترقی پسند لکھا ہے لیکن ان کے ہاں استحصالی رویوں کی عکاسی کی مختلف جہتیں نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں۔

مذکورہ جہتوں میں پہلی جہت عورت کے وجود یا اس کی ذات کے استحصال کی وہ مختلف صورتیں ہیں جو اس کے عہد میں تھیں تاہم وہ جہالت قدامت اور ظالم رسوم و رواج پر مبنی ان استحصالی رویوں پر مبنی رویوں کی بھرپور مذمت کرتے ہیں جن میں عورت کی خود اپنی مرضی و منشا معطل ہو کر رہ جائے اس لیے ان کے افسانوں میں مختلف کردار (عورتوں کے) جل کر مر جاتے ہیں یا خودکشی کرتے ہیں لیکن وہ عورتیں خاموش موت نہیں مرتیں بلکہ ایک خاص احتجاج ریکارڈ کر کے دم توڑتی ہیں اور اس حوالے سے ان کے افسانے "جن کا سایہ "بیوی، انسپکٹر کی عید، ایک عورت ہزار جلوے، باسی پھول اور عدالت اور بدلہ وغیرہ اہم افسانے ہیں البتہ اس حوالے سے ایک اہم پہلو ذہن نشین رہے کہ ان کے ہاں عورت کو اختیار حاصل ہے لیکن عورت کے لیے مغرب زدہ آزادی کو حسینی خود بھی قبول نہیں کرتے۔

حسینی کے ہاں استحصالی رویوں کے عکاسی کی دوسری جہت وہ ہے جس میں وہ ذات پات یا طبقاتی درجہ بندی کے اس استحصالی رویے کی مذمت کرتے نظر آتے ہیں جس میں مذہب یا دھرم کے نام پر ایک انسان دوسرے انسان یا عوام الناس کو کسی ایک گروہ کی غلامی میں دیا جاتا ہے اس دوران نام نہاد غیر معمولی شدت آجاتی ہے اور اس حوالے سے ان کے افسانے حق نمک، بیگار، گونگاہری، سوبھگے، خالی گود، میخانہ، رفیق تنہائی، اور عمل خیر اہم افسانے ہیں جس میں انہوں نے استحصالی رویوں کے مختلف جہتوں کی عکاسی کی ہے بالخصوص زمین دار اور مزدور طبقے کے مختلف کے مابین رسہ کشی کو انھوں نے اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے۔

حیات اللہ انصاری نے سب سے زیادہ حاوی رجحان کے طور پر غریبی کی سطح سے نیچے جینے والے عام مظلوم کسانوں اور ادنیٰ درجے کے لوگوں کے مسائل کو اپنی کہانی کا موقف بنا کر زندگی کی وہ تصویر دکھائی ہے جو ان کے ادبی رہنما پریم چند کو بھی نہیں سوجھا تھا۔

یوں تو ان کے افسانوں کا موضوع جمللہ ہندوستان کی سماجی پستی اور معاشی بدحالی ہے لیکن ان کا میدان اتر پردیش خاص کر لکھنو اور اس کے قرب وجوار کے دیہاتوں کے بے شمار مسائل ہیں۔ زندگی کی ترجمانی کیساتھ تلخ حقائق کی انگلیوں کو تھام کر پریم چند کی روایت کو آگے بڑھانے والوں میں ایک اہم نام حیات اللہ انصاری کا ہے (۳) حیات اللہ انصاری کی افسانوی کائنات انسانی مساوات کا احساس دلاتے ہیں۔

حیات اللہ انصاری نے اپنے بیشتر افسانوں کا موضوع سماج کے دبے کچلے لوگوں کو بنایا جس کے پس پردہ ہندوستان کی سماجی اور معاشی بدحالی کارفرما ہے (۴) حیات اللہ انصاری نے اپنے افسانے میں سماج کے نظر انداز کیے ہوئے طبقے کی زندگی کی دردناک حالات اور ان کی بدحالی کو نہایت بے لاگ حقیقت نگاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔

انصاری نے اپنے لیے الگ راہ بنائی یعنی سماج کے نچلے اور ستم زدہ انسانوں کی زندگی اور اس کے کرب ناک پہلوؤں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا کیونکہ ان کے نزدیک یہ طبقہ سماج کا سب سے کمزور طبقہ ہے انھوں نے اپنے افسانوں میں انسانی زندگی کے سلگتے معاملات کو اجاگر کر کے سماج کے نچلے طبقے کو احساس محرومی اور کس مپرسی پر بھر پور روشنی ڈالی جہاں ان سماجی شعوری پختہ اور فنی ادراک انتہائی بلند نظر آتا ہے دولت وثروت کے زعم میں کمزور طبقوں کا استحصال کرنے والا یہ طبقہ آج دربدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہے معاشرے مُن تہذیبی منافرت کی عکاسی کی۔

مادھو رام اوپندر ناتھ اشک اردو کے وہ قد آور افسانہ نگار ہیں جس نے نورتن، عورت، ڈاچی، کونپل چٹان ناسور، قفس اور کالے صاحب جیسے اہم افسانوی مجموعے اردو ادب کو عطا کیے مذکورہ مجموعوں میں استحصالی رویوں کی متنوع تصاویر کافی شوخ رنگ میں جابجا بکھری پڑی ہیں۔

اشک نے اس دور میں استحصالی رویوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی کہ ابھی ترقی پسند تحریک کا وجود ہی نہیں تھا اور پھر ترقی پسند تحریک کو تین سال بھی پورے نہیں ہوئے کہ ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ ڈاچی مطبوعہ ۱۹۳۹ء منظر عام پر آیا جو پہلی دفعہ "ڈاچی اور دیگر سیاسی افسانے" کے عنوان سے چھپا جس میں انھوں نیم پختہ اور جذباتی انداز میں ہی سہی لیکن استحصالی رویوں کے خلاف خوب جم کے لکھا بقول ڈاکٹر انوار احمد:

"اس مجموعے (ڈاچی) کے ذریعے اشک نے اس دنیا کا نقشہ کھینچا جہاں غریب باپ کی معصوم بیٹی کے

خوابوں کو مشیر مال اپنی قوت سے چھین لیتا ہے جہاں غریب بھوک ٹالنے کے لیے استطاعت سے زیادہ وزن اٹھا کر دم توڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ اور کبھی کبھی تو محرومی اور افلاس کے ستائے ہوئے نوجوان مہاتما گاندھی کے فلسفہ عدم تشدد کو ترک کر کے دہشت پسندی کی خفیہ تحریکوں میں سرگرم عمل دکھائی دیتے ہیں۔"(۵)

اشک نے سیاسی و سماجی اور معاشی و معاشرتی حقائق کو مد نظر رکھ کر ہی ان استحصالی رویوں کی عکاسی ہی سے اپنے افسانوں کے پیکر تیار کیے جو اس دور کے معاشرے زندگی اور انسان کے لیے ناسور کی حیثیت اختیار کر گئے اور جس میں مفلس و قلاش لوگ چھوٹی آرزوئیں تو کجا دو وقت کی روٹی کے لیے ترس رہے ہوتے ہیں اور سرمایہ دار طبقے ممکنہ حد تک ہر حوالے سے ان کا استحصال کرنے کی کوشش میں مگن رہتے ہیں اور اشک نے مذکورہ استحصال کی عکاسی کے ہموار نمونے پیش کیے ہیں جس میں وہ سماج کی خارجی و داخلی کش مکش کو پیش کرتے ہوئے متوسط و غریب گھرانوں کی مشکلات، ہندو عورتوں کے مسائل اور من گھڑت رسوم و رواج کے کڑی در کڑی تکلیف دہ عناصر کے استحصال زدہ رویوں کی خوب صورتوں عکاسی کرتے نظر آتے ہیں جس سے بخوبی اندا ہو تا ہے کہ جس کو ترقی پسند وں نے بعد میں شروع کیا اس مشن کے رستوں کا تعین اشک پہلے سے ہی کر چکے تھے ارضی پہلو زیادہ نمایاں ہے انہوں نے نچلے متوسط طبقے کی سماجی محرومیوں کی سچی کہانیاں لکھیں اور خارجی تشنگی کو داخل حقیقت سے سیر اب کرنے کی کوشش کی ہے۔

منٹو کو ڈاکٹر انوار احمد نے "بر صغیر کا تخلیقی ضمیر" بجاطور ہر کہا ہے کیوں کہ انھوں نے آتش پارے، منٹو کے افسانے، دھواں افسانے اور ڈرامے، لذت سنگ، چغد، سیاہ حاشیے، ٹھنڈا گوشت، بادشاہت کا خاتمہ، یزید سڑک کے کنارے، اوپر نیچے اور درمیان، سرکنڈوں کے پیچھے، پھندانے، بغیر اجازت، برقعے، شکاری عورتیں، رتی ماشہ تولہ، اور ایک مرد، جیسے اہم افسانوی مجموعوں سے اردو ادب کو نوازا، مذکورہ مجموعے یوں تو سیکڑوں موضوعات کا احاطہ بہت خوبصورت اور تخلیقی انداز میں کرتے ہیں لیکن ان میں استحصالی رویوں کی عکاسی جس انداز میں کی گئی وہ افسانہ نگاری کے میدان میں بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے یقیناً چراغ راہ کی حیثیت رکھتی ہے اور ایسا چراغ جس کی روشنی میں وہ بر صغیر کی مقامی معاشرت و سیاست سے لے کر عالمی معاشرت و اجتماعی غلام تک میں موجود ہر استحصالی رویے سے انسانیت کو پاک رکھنا چاہتے ہیں جس میں وہ مذہب اور اخلاق کے لبادے میں سر زد ہونے والے گھناؤنے افعال سے لے کر طبقاتی تفریق، کذب و افترا، فریب و ریا، سماجی بے رحمی، جبر و تشدد، معاشرتی کج ادائی اور معاشی بدحالی انسانیت استحصالی رویوں کے خلاف سراپا احتجاج نظر آتے ہیں۔ بقول انوار احمد:

"اردو افسانے میں جب بھی حق و انصاف کی خاطر بے باکی اور مزاحمت ، ریاکاری کے خلاف للکار ، انسانیت سے لگاؤ کے بلند آہنگ اقرار اور آزادی اظہار کا ذکر ہوتا ہے، سعادت حسن منٹو کا حوالہ ناگزیر ہو جاتا ہے بلکہ میں اگر کہوں کہ اردو افسانے کو منٹو ہی نے یہ لہجہ سکھایا تو مبالغہ نہ ہو گا۔ ان کے افسانوں سے ایک استحصالی اور ریاکار نظام معاشرت و قانون کا نقشہ کھینچ جاتا ہے۔"(۶)

منٹو کے افسانوں میں استحصالی رویوں کی عکاسی کے حوالے سے ڈاکٹر شفیق انجم نے ان کے پہلے افسانوی مجموعے کے کچھ افسانوں کی جانب جس انداز میں اشارہ کیا ہے وہ قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے وہ لکھتے ہیں:

"منٹو کا یہ پہلا افسانوی مجموعہ جوش سے بھرا ہوا اور منٹو کی اشتراکی نظریات سے وابستگی کا آئینہ دار ہے " تماشا" میں سیاسی جبر اور اس کے خلاف ہندوستانیوں کے جذبات کی عکاسی ہے ایک معصوم بچے کی آنکھوں سے ایک ہولناک منظر کو بیان کرتے ہوئے منٹو نے کوئی جانب داری نہیں دکھائی، فضا و ماحول کی تلخی خود بولتی ہے اور جبر و بغاوت کی موجود صورتِ حال کو معمور کرتی ہے خونی تھوک میں مزدوروں سے گہری ہمدردی اور مغرور سامراج کی بے حسی کی وضاحت ملتی ہے قلی انگریز کی ٹھوکر سے مر جاتا ہے وہ اور تو کچھ نہیں کر سکتا لیکن مرتے وقت اپنا خونی تھوک اس انگریز کے منہ پر تھوک اگل دیتا ہے۔"(۷)

منٹو کے پہلے افسانوی مجموعے میں استحصالی رویوں کے خلاف بغاوت کے حوالے سے ڈاکٹر برج پریمی نے اس سے بھی زیادہ گہری بات کہی ہے وہ لکھتے ہیں:

"منٹو کی یہ کہانیاں عام طور پر اس زمانے کے سیاسی واقعات سے متاثر ہو کر لکھی گئیں ان میں جلیانوالہ باغ، مارشل لا، مزدوروں اور غریبوں پر ہوتے مظالم اور جنگ آزادی وغیرہ کے واقعات کے بارے میں مصنف کا ردعمل کھل کر سامنے آتا ہے۔"(۸)

مذکورہ بالا اقتباسات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ استحصال کے تمام اور مراکز کی نشان دہی اور اس کی مذمت ابتدا ہی سے منٹو کے افسانوں کا اولین وظیفہ رہا ہے۔

ماجرا یہ ہے کہ منٹو ایک باکمال تخلیق کار ایک بیدار مغز افسانہ نگار ہونے کے علاوہ سماجی حوالے سے متنوع پہلو رکھنے والی شخصیت تھے بالخصوص قیام بمبی کے دوران ان کی ملاقات مزدوروں، محنت کشوں، شرابیوں، کلرکوں، چپڑاسیوں، فلمی اداکاروں اور اداکاراؤں، بچوں، جوان، بوڑھوں، خواجہ سراؤں، فقیروں، نجومیوں، جوتشیوں، افسروں، سیاست دانوں، سرمایہ داروں، وغیرہ ہر طبقے سے ان کی ملاقاتیں، رفاقتیں، اور دوستیاں رہیں تاہم اس نے ان سب کے شب و روز، طرز ہائے زیست، مسائل ترجیحات اور معاملات کا گہرا مشاہدہ کیا یوں ان کی الجھنوں پریشانیوں، مسائل و مشکلات اور سیاسی و معاشی جبر کا انہیں گہرا ادراک حاصل ہوا اور اس ادراک کو جب

اس نے تخلیقی سانچے میں ڈھالا تو لاجواب افسانوں کی صورت میں ظاہر ہوا بالخصوص ان میں استحصالی رویوں کی عکاسی اور جبر کے خلاف بغاوت کی طرف فرمان فتح پوری نے یوں اشارہ کیا ہے:

"منٹو کتنا بڑا باغی اور انقلابی تھا اس کے سینے میں برطانوی سامراج کے خلاف کیسا لاوا ابل رہا تھا، سرمایہ دارانہ نظام اور طبقاتی استحصال سے اسے کتنی نفرت تھی۔"(۹)

یوں دیکھا جائے تو اس حوالے سے ان کے افسانے تماشا، خونی تھوک، انقلاب پسند، دیوانہ شاعر، طاقت کا امتحان، شغل، نعرہ، نیا قانون، چودی، ماتمی جلسہ، سوراج کے لیے، ٹوبہ ٹیک سنگھ، وغیرہ نمائندہ افسانے ہیں، جس نے منٹو نے ہر اس عمل، طبقے، شخص، گروہ اور قانون کی بھرپور مذمت کی جس کا رستہ استحصالی رویوں کی جانب کھلتا ہے۔

مولانا حالی کے نواسے اور اردو کے عظیم افسانہ نگار صحافی ناول نگار، ڈراما نگار، رپوتاژ نگار، اور آپ بیتی نگار ، خواجہ احمد عباس کو ادبی تخلیقی دنیا میں وہ مقام نہیں ملا، جس کے وہ حق دار تھے۔ اردو انگریزی اور ہندی میں لکھنے والے اس قلم کار نے اردو افسانے کو ایک لڑکی، پاؤں میں پھول، زعفران کے پھول، میں کون ہوں، کہتے ہیں جس کو عشق، گیہوں اور گلاب، دیا جلے ساری رات، نیلی ساڑھی اور نئی دھرتی نئے انسان جیسے مجموعے عطا کیے۔

اس کے علاوہ ان کے تین افسانوی مجموعے ہندی زبان میں بھی شائع ہوئے۔ کافی بسیار نویس تخلیق کار ہونے کے باوجود بھی خواجہ احمد عباس کا نقطہ نظر بلکل واضح اور ٹھوس ہے اور وہ ڈاکٹر پروین اختر کے الفاظ میں یہ ہے کہ خواجہ احمد عباس کا زندگی سے متعلق نقطہ نظر خالص سیاسی تھا وہ سماج سے اونچ نیچ اور ظلم و ستم کر کے ایک صاف ستھرا نظام چاہتے تھے (۱۰) اور اس کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ خواجہ احمد عباس پر ترقی پسند نقطہ نظر کا اس قدر غلبہ ہے کہ وہ عموماً افسانوی ادب کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں وہ خالصتاً مقصدیت کے قائل ہیں۔(۱۱) تاہم ایک طرف تو تخلیقی جوہر کا انتہاؤں پر ہونا اور دوسری طرف طرز فکر کا ٹھوس، دونوں عناصر نے ان کے افسانوی آہنگ کو اتنا تیز اور بلند کر دیا تھا کہ کرشن چندر جیسے سرکش افسانہ کو لکھنا پڑا کہ "اگر کبھی مخالف انقلاب آیا اور فسطائیت کے اندھیرے نے ہمیں گھیر لیا تو عباس کی تحریریں سب سے پہلے جلائی جائیں گی۔(۱۲)

کرشن چندر کے موقف سے اتفاق اس لیے لازم ہو جاتا ہے کہ خواجہ احمد عباس اپنے موقف کا اظہار بغیر لگی لپٹی کرتا ہے اسی لیے تو استحصالی رویوں کے خلاف ان کا قلم جس انداز میں شعلے اگلتا ہے وہ شاید ہی ان کے معاصر افسانہ نگاروں میں کسی کے ہاں وہ انداز کی حقیقت نگاری ہو بقول ڈاکٹر انوار احمد:

"افسانوی تدبیر کاری کے تقاضوں کو پیش نظر رکھے بغیر، جذباتی، مثالی، اور سطحی انداز میں قحط غربت،

محرومی معاشی استحصال، سیاسی دیوالیہ پن یا نفس پرستی کے خلاف اپنے غصے کا اظہار کرتا ہے۔"(۱۳)

خواجہ احمد عباس کے طرز فکر میں صحافیانہ انداز تقریباً ہر جگہ غالب نظر آتا ہے لیکن انھوں نے جس تخلیقی انداز میں اپنے ماحول و معاشرے کے مسائل کو برتا شاید ہی کسی افسانہ نگار نے ان کو اس انداز میں پیش کیا ہوا سی لیے تو ان کے ہاں فاقہ زدہ مزدوروں ، اندھے بھکاریوں اور ننگی طوائفوں کے استحصال زدہ حالات کی قلمی تصویریں باضمیر قاری کے رونگھٹے کھڑے کر دیتی ہیں اس کے علاوہ ظالم سرمایہ داروں، جابر زمین داروں اور نام نہاد مذہبی ٹھیکے داروں کے انسانیت کش اور استحصالی رویوں وہ کسی صورت برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں اس حوالے ان کے افسانے بمبی رات کی بانہوں میں، اندھیرا اجالا، اجنتا، چوراہا، پاؤں میں پھول، معمار، کایا کلپ، تین عورتیں، وغیرہ ان کے نمائندہ افسانے ہیں۔

معاصر افسانہ نگاروں کے کرداروں کے برعکس خواجہ کے کردار عصمت دری، محرومی، غربت استحصال، اور افلاس کے باوجود مزحمت کرتے نظر آتے ہیں اور جب یہ کردار خواجہ احمد عباس جیسے حقیقی تخلیق کار، سماجی مفکر اور روشن خیال افسانہ نگار کے ہاتھوں افسانے کے پیکر میں ڈھلتے ہیں تو ایک خوبصورت تخلیقی فضا پورے افسانے کے اندر پیدا کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد اشرف ان کے افسانوں میں ان کے تخلیقی انداز، عملی شخصیت اور استحصالی رویوں کے خلاف احتجاج کو ان الفاظ میں ریکارڈ کرتے ہیں:

> "خواجہ احمد عباس تحریر سے زیادہ عملی جدوجہد پر یقین رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ تحریر کے بالمقابل میدان عمل میں زیادہ سرگرم اور فعال نظر آتے ہیں جہاں وہ فرسودہ نظام حیات، پامال طرز معاشرت، اور ملکی حکمرانوں کی غلط پالیسیوں کے خلاف سراپا جہاد نظر آتے ہیں۔"(۱۴)

اسے اردو افسانے کی خوش قسمتی کہیں یا اعجاز تصور کریں کہ ابتدا ہی سے اسے اس قدر زرخیز تخیل حیرت انگیز ذہانت اور تعجب انگیز تخلیقی کمالات رکھنے والی شخصیات نصیب ہوئیں کہ جس نے اس کو مذہبی سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، نفسیاتی، تکنیکی فنی لسانی، ہر حوالے سے غیر معمولی وسعتیں عطا کیں یوں تو احمد ندیم قاسمی تک آتے آتے اردو افسانے کو سجاد حیدر یلدرم سے وابستہ افسانہ نگاروں کے علاوہ پریم چند اور دبستان پریم چند سے وابستہ بیسیوں افسانہ نگاروں نے فنی و فکری حوالوں سے غیر معمولی وسعتیں عطا کیں لیکن ان میں پریم چند کے علاوہ بدری ناتھ سدرشن، علی عباس حسینی، حیات اللہ انصاری، اوپندر ناتھ اشک، سعادت حسن منٹو، خواجہ احمد عباس اور نگارے گروپ سے متعلقہ افسانہ نگار خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

مذکورہ افسانہ نگاروں نے اردو افسانے کو فکر و فن کے حوالے سے اس قدر وسعتیں بخشیں کہ جس کو بآسانی عالمی ادب میں بطور مقابلہ بڑے فخر کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے، لیکن ان افسانہ نگاروں کا غالب رنگ ان استحصالی رویوں کی عکاسی اور اس کے خلاف بھرپور مذمت ہے۔ جس نے نہ صرف مقامی بلکہ آفاقی سطح پر نوع انسانی ہمیشہ مصائب و مشکلات سے دوچار کیا۔

وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو پہلی جنگ عظیم کے بعد نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا انتہائی سخت مصائب و آلام کا شکار ہوئی پہلی جنگ عظیم میں ایک اندازے کے مطابق ۶ کروڑ انسان بے دردی سے قتل کیے گئے جس میں وحشت و بربریت اور سنگ دلی و سفاکیت کے مارے مذہب و تہذیب اور تمدن معاشرت کی دھجیاں اڑائی گئیں ۱۹۱۷ء میں انقلاب روس نے مذکورہ سفاکیت و بربریت کے شعلوں کو تیز تر کر دیا اقتصادی و معاشی بدحالی، جہالت، عدم تحفظ، عدم مساوات جیسے استحصالی رویوں نے جنم لیا، بالخصوص ہندوستان میں انگریزوں کے قبضے کے بعد یہاں کا پورا نظام شعوری طور پر تبدیل کیا گیا جس کے سارے ڈھانڈے آخر میں جا کر استحصالی طرز فکر اور طرز عمل سے جا ملتے ہیں لیکن انقلاب روس نے محکوم اور استحصال کے شکار قوموں میں ایک نیا ولولہ پیدا کیا محنت کشوں کا احساس پیدا ہونے لگا جلد ہی اس احساس نے تصادم کی شکل اختیار کر لی اور اس تصادم میں دنیا بھر کے تخلیق کاروں نے مظلوم اور مزدور طبقوں کا ساتھ دیا بلکہ ترقی پسند تحریک کے اعلان میں تو واضح اعلانات کیے گئے اور انہیں واضح طور پر بتایا گیا کہ ان کا فرض ہے کہ "وہ ایسے ادبی رجحانات کو نشو نما پانے سے روکیں جو فرقہ پرستی نسلی تعصب اور استحصال کی حمایت کرتے ہیں۔۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے یہ بھوک، پیاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔"(۱۵)

یوں دیکھا جائے تو اردو افسانہ ابتدا سے لے کر احمد ندیم قاسمی تک سرمایہ دارانہ و جاگیر دارانہ نظام، بھوک، پیاس، افلاس، نسلی تعصب، ناجائز منافع خوری، سودی نظام، جعلی پیروں، اور نام نہاد مذہبی ٹھیکے داروں کے اوچھے ہتھکنڈوں، اندھی تقلید، محنت کش، اور مزدور طبقے کی زبوں حالی، طبقاتی درجہ بندی، غرض تمام تر استحصالی رویوں کی عکاسی اور اس کی مذمت بھرپور انداز میں کی۔

حوالہ جات

۱. شہزاد منظر، (مضمون) ترقی پسند افسانے کی روایت اور نیا افسانہ (مشمولہ) ترقی پسند ادب از ڈاکٹر قمر رئیس

۲. انور سدید، ڈاکٹر

۳. محمد اشرف ڈاکٹر، ترقی پسند تحریک اور اردو فکشن، دہلی: ایجو کیشنل ہاؤس، ۲۰۱۴ء، ص ۳۲

۴. ایضاً ص ۳۵

۵. انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ

۶. ایضاً ص

۷. شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ (بیسویں صدی کی ادبی تحریکیں اور رجحانات کے تناظر میں)، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۸ء، ص ۱۰۶

۸. برج پریمی، سعادت حسن منٹو حیات اور کارنامے، سرینگر: مرزا پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء، ص ۱۸۳

۹. فرمان فتح پوری ڈاکٹر، اردو افسانہ اور افسانہ نگار، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۱۳۲

۱۰. پروین اختر، ڈاکٹر، مضمون مشمولہ: تاریخ ادبیات مسلمانان پاک وہند، جلد پنجم، ص ۴۹۱

۱۱. ایضاً، ص ۴۹۲

۱۲. انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، ص ۴۲۳

۱۳. ایضاً

۱۴. محمد اشرف، ڈاکٹر، ترقی پسند تحریک اور اردو فکشن، ص ۱۵۴

۱۵. علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، علی گڑھ: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۵۱ء، ص ۱۳